نفس مطمئنّہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

اطمینان کی صفت مقابل اضطراب ہے۔ اضطراب دماغ میں بھی ہوتا ہے، اور دل میں بھی، اور ان دونوں کے نتیجہ میں پھر عمل میں۔

اضطراب دماغ کا یہ ہے، کہ انسان کی رائے ڈانواڈول ہو۔ کبھی کچھ سوچے اور کبھی کچھ، اور دل کا اضطراب یہ ہے کہ صحیح فیصلہ تک پہنچ جانے کے بعد اس کی ہمت ہچکولے کھا رہی ہو، کبھی اسے جوش آتا ہو، اور کبھی نتائج کے خطرے سے اس کی ہمت پست ہونے لگتی ہو۔

اور اس سب کے نتیجہ میں عمل میں جو اضطراب ہوتا ہے اس میں داخل ہیں: عاجلانہ اقدامات، گھبراہٹ کی باتیں، اقوال وافعال میں تضاد، اور اقدامات میں تذبذب وغیرہ کے علامات۔

اضطراب کے جتنے پہلو ہیں۔ ان کے بالمقابل اطمینان کے پہلو ہیں۔

رائے میں استقلال، پھر ارادہ میں استقلال، عمل میں ٹھہراؤ اور ہر کام کا مناسب وقت پر بغیر کسی جلد بازی کے انجام دینا اور خطرات کی شدّت سے قدم میں تزلزل پیدا نہ ہونا۔

درحقیقت صبر، استقلال اور ثبات قدم، سب اسی اطمینان نفس کے مختلف اعتبارات سے تعبیرات ہیں۔

اب اطمینان اور اضطراب کے ان پہلوؤں کے لحاظ سے جب ہم مجاہد کربلا حضرت امام حسینؑ کے کردار پر از اوّل تا آخر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں اطمینان کا ہر رخ اتنا مکمل نظر آتا ہے کہ 'نفس مطمئنہ' کی لفظ جیسے اس مصداق سے مخصوص معلوم ہوتی ہے۔

آیئے! ان میں سے ایک ایک پہلو کو لیں اور اس کے اعتبار سے سید الشہداء علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ کریں۔

'اطمینان دماغ' یعنی رائے کی یکسوئی اور یاد رکھنا چاہئے کہ اس محل پر جب رائے کی لفظ کا ہم استعمال کرتے ہیں، تو عام انسانی زبان میں ان 'عقائد ومسلّمات' سے قطع نظر کرتے ہوئے جن پر بنائے دلائل قطعیہ حضرت امام حسینؑ کی منصبی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے۔ مگر ایک بلند مرتبہ انسان کی حیثیت سے ہر مذہب وملت کے انسان سے امام حسینؑ کا جب تعارف کرانا ہو تو اس وقت 'رائے' ہی کے لفظ استعمال کرنا پڑتی ہے۔

رائے کا استحکام نمایاں کس وقت سے ہوتا ہے؟ جب سے وہ قریبی حالات نمایاں ہوئے، جو کشاں کشاں تاریخ کی رفتار کو واقعۂ کربلا تک لائے۔ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صلح اور خاص شرائط کے ماتحت آپ کا حکومت ظاہری سے دستکش ہونا اور امیر شام کے قبضہ کا تمام ممالک اسلامیہ پر بلا استثنائے عراق وحجاز قائم ہو جانا ہے۔

معلوم ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی فوج کے کثیر التعداد افراد اس صلح سے متفق نہ تھے۔ اور جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلح پر جو آپ نے حدیبیہ میں مشرکین کے ساتھ فرمائی تھی بہت سے نام نہاد مسلمان برہم تھے، اسی طرح اس صلح سے جو امام حسنؑ نے امیر شام کے ساتھ فرمائی تھی بہت سے نام نہاد شیعہ برہم تھے۔ اور ایک حلقہ میں یہ پروپیگنڈا بھی تھا، کہ چھوٹے بھائی یعنی حضرت امام حسینؑ اپنے بڑے بھائی کی اس صلح سے اتفاق نہیں رکھتے۔ اس موقع پر طبری سے بھی زیادہ قدیم مورّخ ابوحنیفہ دینوری کی کتاب الاخبار الطوال کی یہ روایت بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ چند اہم سردار امام حسنؑ کی فوج کے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت امام حسنؑ کو اس صلح کا جو

انہوں نے کی ہے پابند رہنے دیجئے اور آپ ہماری سربراہی کیجئے اور ہم ایک دم شام پر حملہ کردیں، پھر دیکھئے گا کہ معاویہ کو کس طرح ہم شکست دیتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے اس کا جو تاریخی جواب دیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ اب امیر شام کی حیات تک خاموش بیٹھے رہو، اس کے بعد پھر مجھ سے کچھ کہنا۔

یہ ہے امیر شام کی زندگی کے اختتام سے بیس ۲۰ برس پہلے کی بات اور اب امیر شام کی زندگی کا خاتمہ رجب ۶۰ھ میں ہوتا ہے اور بس کارنامۂ حسینی کا، جو ۱۰ محرم ۶۱ھ کو آپ کی شہادت کی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچا، آغاز ہوجاتا ہے تو کیا حضرت امام حسینؑ کے اس جواب میں جو بیس (۲۰) برس پہلے دیا گیا تھا صاف اس مستقبل کی جو اُس کے بیس برس بعد آنے والا تھا خبر نہ تھی اور کیا یہ آپ کے غیر متزلزل استقلال رائے کا ناقابل انکار ثبوت نہیں ہے۔

پھر جب سے امیر شام نے بیعت یزید کے لئے کوشش شروع کی، آپ نے جو بیعت سے انکار فرمایا، کسی لمحہ بھی اس میں کوئی تذبذب نظر آیا؟ تذبذب کا ایک معمولی اثر یہی ہوسکتا تھا کہ آپ اپنے ہمدردوں کو جمع کر کے مشورہ ہی لیتے کہ مجھ سے بیعت کا مطالبہ ہورہا ہے آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ تب کسی حد تک یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ آپ کو صورت حال کی نزاکت کی وجہ سے تردد ہے۔ مگر کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی ایسا نہیں بتاتی۔

اس بنیادی مسئلہ کا کیا ذکر؟ انکار بیعت کے بعد جو طریقہ کار آپ نے اختیار فرمایا، اس میں بھی آپ نے لوگوں سے کبھی کوئی مشورہ نہیں کیا۔ کچھ لوگ سچی یا نمائشی ہمدردی سے خود ہی آ آ کر طرح طرح کی رائیں دیتے رہے، جنھیں آپ نے مختلف طرح کے جواب دے کر ٹال دیا اور جو طریق کار خود اختیار فرمالیا تھا اس میں ذرّہ بھر بھی تبدیلی نہیں فرمائی۔

اس سے دوسرا جزو دل کا اطمینان بھی نمایاں ہے، یعنی جو طریق کار طے کیا، اس سے نہ کسی دوست کی دوستی کے اثر سے ہٹے، اور نہ کسی دشمن کی دشمنی کے دباؤ سے اور اس کے نتیجے میں عملی استقلال و اطمینان جو آپ سے ظہور میں آیا، وہ اپنی منفرد مثالی شان رکھتا ہے۔

اضطراب نفس کے علامات میں سب سے پہلا درجہ عاجلانہ اقدامات کا ہے۔

حضرت امام حسینؑ پہلے دن سے سمجھے ہوئے ہیں کہ مجھے موت کے دریا میں تیرنا ہے، مگر جو موت کو یقینی طور سے دل میں ٹھانے ہوئے ہے، وہ حفظ حدود آئین شریعت و عقل کے لئے جان کے تحفظ کی صورتیں بھی اختیار کررہا ہے کبھی مکہ میں پناہ لے کر اور کبھی عین موقع حج میں مکہ کو چھوڑ کر، اور کبھی کربلا پہنچنے کے بعد شرائط صلح پیش فرما کر، اور یہاں تک کہ روز عاشورا اتمام حجت کے لئے خطبے پڑھ کر اور اس وقت کا انتظار کر کے جب آغازِ جنگ ادھر سے ہو۔

عمل میں یہ ٹھہراؤ بغیر کامل سکون و اطمینان نفس کے ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر 'گھبراہٹ کی باتیں' اور 'بیانات میں تضاد'، اس کی کوئی اموی مورخ بھی کبھی آپ کی جانب نسبت نہیں دے سکا۔

حالانکہ مصلحت جنگ کے ماتحت قانون شرع میں بھی کسی حد تک واقعات کو چھپانے کی اجازت دی گئی ہے مگر آپ نے دوست اور دشمن کسی کے سامنے بھی صحیح صورتِ حال پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں فرمائی یہاں تک کہ حضرت مسلمؑ وہانی کی خبر شہادت جو عام ساتھیوں سے پردہ میں رہی تھی۔ آپ نے خود اپنی ایک تحریر (تقریر) کے ذریعہ سے سب پر ظاہر کردی اور اپنے ساتھیوں کو اجازت دی، کہ وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں جس سے آپ کے ساتھ کا مجمع جو راستے میں بہت ہوگیا تھا منتشر ہوگیا، اور وہی قلیل افراد رہ گئے، جو مکہ معظّمہ سے ساتھ آئے تھے، مگر آپ نہ پہلے اس سے ڈرے اور نہ بعد میں اس نتیجہ کے سامنے آنے پر پریشان ہوئے بلکہ گویا مزید اطمینان کی سانس لی، کہ اب میرے کارنامہ میں وہ جھول نہیں آسکتا، جو ناقص ساتھیوں کی وجہ سے آسکتا تھا، اور وہی کردار شبِ عاشور تک قائم رہا جب مخالف سمت سے حملہ ہوجانے کے بعد آپ نے

ایک شب کی مہلت حاصل کر کے پھر اپنے ساتھیوں کو اپنا ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دی۔ یہ اور بات ہے کہ اب مجمع خالص افراد کا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مگر بروایت طبری جب ایک شخص ضحاک بن عبداللہ مشرقی نے اس حد تک اس اجازت سے فائدہ اٹھایا، کہ انہوں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ اس وقت تک رہوں گا جب تک جنگ چھڑے، اور آپ کی نصرت بھی کروں گا۔ مگر پھر اس کے بعد جب سوا جان دینے کے کوئی منزل نہ رہے گی، تو میں جدا ہو جاؤں گا، تو آپ نے بکشادہ پیشانی ان کو اس کا حق دیا، اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ روز عاشور آپ کی نصرت میں جنگ بھی کی، اور بعض دشمنوں کو تہ تیغ بھی کیا، اور پھر حسب وعدہ آپ سے رخصت ہونا چاہا، تو آپ نے ایسے نازک وقت میں بھی ذرّہ بھر ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کردار ایک ایسے ہی 'نفس مطمئنہ' کا ہوسکتا ہے۔ جس کا نام تاریخ کی زبان میں **حسینؑ** کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

اقدامات میں تذبذب رائے میں تحیّر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہاں جس طرح اصل معاملہ میں حضرت امام حسینؑ نے کبھی کسی سے کوئی مشورہ نہیں لیا، اسی طرح پورے کارنامہ میں طریق کار کے جزئیات تک میں کوئی ایک موقع کبھی ایسا نہیں آیا ہے کہ آپ نے دوستوں اور عزیزوں کو جمع کر کے پوچھا ہو، کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ حملہ ہو جانے کے بعد بھی آپ کی طرف سے ہدایات ہی ہدایات، احکام ہی احکام ملتے ہیں اور اصحاب، انصار اور اعزا کی طرف سے تعمیل ہی تعمیل، گویا بہتر (۷۲) نفس سب تھے اعضاء، اور ان میں کارفرما دل و دماغ صرف ایک تھا، جس کا نام ہے **حسینؑ**، جس میں ذرّہ بھر کوئی اضطراب نہیں ہے، تا کہ اسے سہارا دینے کے لئے کسی اور دل و دماغ کے ہمّت و عزم کے کام کرنے کی ضرورت ہو۔

کربلا کے ایسے قیامت خیز ہنگامۂ مصائب میں اعزّاء و انصار میں سے ہر ایک کے ساتھ امام حسینؑ کا برتاؤ، ہر ایک کے حقوق کا لحاظ، حفظ مراتب کے ساتھ مساوات اسلامی کا تحفظ، حقوق اللہ اور حقوق الناس کے جزئیات تک کی مراعات، ترتیبِ شہداء، ہر ایک کی رخصت اور شہادت کے وقت اس کے شایانِ شان تاثراتِ غم کے مظاہرہ کے ساتھ جو درحقیقت اس شہید کے قدر و مرتبہ کے آئینہ بردار تھے، پھر آئندہ قربانی کے پیش کرنے پر مستعدی، یہ سب اسی اطمینانِ نفس کے شواہد و آثار تھے، جو آنکھوں کے سامنے آرہے تھے اور اب کتب مقاتل و تاریخ کے صفحات پر ہمارے سامنے ہیں۔

یہی اطمینانِ نفس ہے جسے دشمن تک کی نگاہ نے محسوس کیا اس وقت جب آپ زخموں سے چور، بہتر داغ دل پر، اور بے شمار تیر و نیزہ و شمشیر کے زخم جسم پر کھائے ہوئے میدان جنگ میں شہادت کی منزل سے قریب سے قریب تر ہو رہے تھے، تو دشمن نے اس وقت بھی کوئی ایسی امتیازی خصوصیت محسوس کی، جس کی گواہی طبری کی تاریخ میں اب تک محفوظ ہے۔ کہ **"مارأیت مکثوراً قط قتل اهل بیته و انصاره اربط جاشیا من الحسین علیہ السلام"** میں نے کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو زخموں سے چور ہو اور جس کے عزیز و انصار قتل ہو چکے ہوں اور وہ حسینؑ سے زیادہ مطمئن نظر آتا ہو۔

یہ تھے حسینؑ جو بلا شبہ اس عظیم اطمینان نفس کے حامل تھے کہ جب ان تمام مشکلات و مصائب کے ہفت خوانوں کو طے کئے ہوئے وہ اپنے خالق کی بارگاہ کے سامنے پہنچیں، تو خود معبود خیر مقدم کے طور پر آواز دے۔ **یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔**

جو سورۂ فجر کی آخری آیت ہے اور اسی لئے یہ سورہ سورۃ الحسینؑ کے لقب ہی سے ملقب ہو گیا ہے۔

یہ مقالہ امامیہ مشن، لکھنؤ کے سلسلہ اشاعت (نمبر ۵۳۵) میں محرم ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

❁❁❁